Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:8 (1967)

اسلام پاکستان میں

پروفیسر شیخ محمد عثمان

اسلام پاکستان میں نہایت اہم اور دلچسپ موضوع ہے اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ میں یہاں اس کے صرف دو تین پہلوؤں ہی سے بحث کروں گا۔

(۱)

سب سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہوگا کہ ہماری آبادی کے مختلف طبقے اسلام کے بارے میں کیا ذہنی رویہ (ATTITUDE) رکھتے ہیں۔ بلا شبہ ملک کی بھاری اکثریت اسلام کی دلدادہ اور شیفتہ ہے۔ دیہات میں بسنے والے پاکستانی اسلام کے بارے میں تفصیلاً بہت کم جانتے ہیں، اسلامی اصولوں اور ضابطوں پر ان کا عمل بھی شاید کسی معیار پر پورا نہیں اُترتا، بہت سے مرد اور عورتیں مختلف نوع کی توہم پرستی کا شکار بھی ہیں، ان میں اسلام کی انقلابی روح، اور زندگی کو بہتر اور برتر بنانے کی اسلامی تڑپ بھی موجود نہیں، جہالت اور ناخواندگی ان کے اور اسلام کی سچی تعلیمات کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی ہے، یہ سب باتیں اور سب کمزوریاں اپنی جگہ پر تسلیم، مگر یہ امر بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ پاکستان کے یہ عوام، جن میں دیہات کی تمام آبادی (چند جاگیردار گھرانوں کو چھوڑ کر) اور شہروں میں بسنے والے مزدور اور دوسرا "نچلا" طبقہ شامل ہے، اسلام سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ ان کے گہرے جذبات کو صرف اسلام ہی اپیل کر سکتا ہے۔ اور ان کے فکر و عمل کے جمود میں فقط اسی کے نام سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔

ان کے ایمان میں بے شک بصیرت اور بصارت، روشنی اور حرارت نہیں ہے، مگر اس میں اوّل درجے کی وابستگی اور اُستواری پائی جاتی ہے۔ ان میں اسلامی تعلیمات کا فہم نہیں ہے لیکن اسلامی روایات اور قرونِ اولیٰ کی روح ان کے لاشعور میں اسی طرح سمائی ہوئی ہے کہ ان کی شخصیتوں کا جزوِ اعظم اسلام ہی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس میں کچھ علم و معلومات کے باوجود ... اور خلفائے راشدین کے حالات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج بھی افراد اور اعمال کے نیک و بد کا معیار ہیں۔

یہ لوگ اسلام کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے اور دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آئے اور باقی تمام دنیا میں بھی اسلام کا بول بالا ہو۔

ہمارے درمیانے طبقے میں شہروں کا درمیانہ پڑھا لکھا طبقہ، خواندہ یا نیم خواندہ خوش حال کاروباری لوگ، درمیانے درجے کے سرکاری اور غیر سرکاری افسر اور اسی معیار کے دوسرے افراد اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے بیشتر طلبہ شامل ہیں۔ مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس طبقے کے اسلامی جذبات قریب قریب عوام کے اسلامی جذبات سے ملتے جلتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اِس طبقے کے کچھ افراد اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی تاریخ کا قدرے بہتر فہم رکھتے ہیں اور کہیں کہیں ان میں تنقیدی نظر بھی پائی جاتی ہے۔ اِس طبقے کا زیادہ باشعور عنصر اسلام پر ملکی اور بعض صورتوں میں غیر ملکی زبانوں میں شائع ہونے والی کتابیں بھی پڑھتا ہے، دوسرے اسلامی ملکوں کے حالات اور رفتار ترقی سے بھی کچھ دلچسپی رکھتا ہے اور اپنے معاشرے کا عوام کی نسبت بہتر اور پُرجوش نقاد ہے۔ اس طبقے کے بعض افراد جو کاروباری ترقی میں منہمک اور جائز و ناجائز ذرائع سے روپیہ کمانے کی دوڑ میں مصروف ہیں، رفتہ رفتہ اسلام اور اسلام کی ترقی سے "بیگانہ" ہو رہے ہیں، نہ اس لئے کہ اسلامی تعلیمات پر اِن کا ایمان اُٹھتا جا رہا ہے بلکہ اس لئے کہ دنیوی لذتوں کا میدان ان کے سامنے یوں کھلا ہے کہ انہیں کسی اور چیز میں دلچسپی لینے کی فرصت میسّر نہیں آتی۔

اس طبقے کی اکثریت میں اتنی جان، اتنی جستجو اور اس قدر ذوقِ عمل ضرور ہے کہ اسلام کے نام پر جب کوئی تحریک اٹھتی ہے یا کوئی داعی اسلام کے نام پر ان کو اپنی طرف بلاتا ہے تو یہ اپنی طبعی پیاس اور توانائی کے باعث اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی "حلقے" میں شریک ہو جائیں تو اپنی استطاعت کے مطابق اور بعض اوقات استطاعت سے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد سے اِس طبقے کے بے شمار افراد کو اسلامی تحریکوں اور ان کے داعیوں سے سخت 'مایوسی' ہوئی ہے، اور ان کے مخلصانہ جوشِ عمل کو شدید صدمے پہنچے ہیں، اس کے باوجود یہ طبقہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سخت جان اور تازہ دم ہے، اور کسی بھی نئی 'دعوت' پر لبیک کہنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر سکتا ہے۔

اس طبقے کی اکثریت بھی یہ چاہتی ہے کہ ہمارے ملک کا سیاسی اور معاشرتی نظام جس میں تعلیمی اور

معاشی نظام بھی شامل ہیں، اسلامی اصولوں کے مطابق چلایا جائے اور نئی نسل کو اِن اصولوں کا بہتر فہم دیا جائے۔

اب ہم اپنے مطالعے کے ایک مشکل اور نازک مرحلے میں داخل ہوتے ہیں اور ملک کے 'اعلیٰ' طبقے کا جائزہ لیتے ہیں۔

اوپر کے طبقے میں اعلیٰ سرکاری حکّام، چوٹی کے جاگیردار، ملک کی تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے سرمایہ دار گھرانے، اور وہ دانش ور شامل ہیں جو ادب یا سائنس کی اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد ملک کے 'ماہرین' کے زمرے میں شریک ہو چکے ہیں۔ اِن میں یونی ورسٹیوں کے پروفیسر، مقتدر اخباروں کے مدیر، آرٹس اور سائنس کونسلوں کے ذی اثر عہدے دار اور وہ چند مصنف اور فن کار بھی شامل ہیں جو کسی عہدے کے بغیر محض اپنے کام یا مراسم کے باعث ممتاز ہیں۔

اس طبقے کے مختلف افراد اپنے ذہنی رویوں کے اعتبار سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کو ایک 'طبقہ' قرار دینا بظاہر ایک جسارت معلوم ہونی چاہیئے۔ تاہم ہماری زندگی میں اقتدار اور تموّل کی قدر اس قدر مؤثر قدر رہے گی جب تک ہمارا معاشرہ اپنی موجودہ صورت پر قائم ہے۔ اس قدرِ مشترک کے حامل تمام عناصرِ معاشرہ کو خواہ بعض ذہنی رویوں کے اعتبار سے وہ کتنے ہی مختلف بلکہ متضاد کیوں نہ ہوں، واقعاتی لحاظ سے انہیں ایک ہی طبقہ قرار دینا چاہیئے۔ اِس فعّال اور ذی اثر طبقے کو پیشِ نظر مطالعہ کے اعتبار سے میں چار حصوں میں مزید تقسیم کرنا چاہوں گا۔

پہلا حصہ وہ ہے جو شعوری یا نیم شعوری طور پر اسلام اور اسلامیت سے ایک ذہنی بُعد رکھتا ہے۔

دوسرا حصہ وہ ہے جو اِس ضمن میں بے تعلق (INDIFFERENT) یا غیر جانب دار ہے۔

تیسرا وہ جو اسلام سے ایک گونہ جذباتی لگاؤ اور اس کی حقانیت اور سچائی پر اعتقاد تو رکھتا ہے مگر اس کے لئے کوئی قدم اٹھانا یا کسی تحریک کا ساتھ دینا ضروری خیال نہیں کرتا ——— اور

چوتھا حصہ وہ ہے جو اسلام کے بارے میں ایک مثبت یقین رکھتا ہے اور اسلام کے نام پر جو چاروں طرف نعرے بلند ہوتے ہیں ان کی گونج سے اپنے دل میں ایک احساسِ ذمہ داری اور بعض اوقات احساسِ جرم محسوس کرتا ہے۔ اور اس ضمن میں تھوڑی بہت تگ و دو کا بھی آرزو مند ہے لیکن اس راہ کی مشکلات دیکھ کر اور مناسب رہنمائی نہ پا کر اپنے آپ کو بڑی حد تک بے بس پاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب میں ان عناصر کا قدرے تفصیل سے ذکر کرتا ہوں۔

اس بات کا اعتراف کرنے میں ہمیں کچھ باک نہیں ہونا چاہیئے کہ ہمارے ملک کی "مسلمان" آبادی کے اعلیٰ طبقے کا ایک حصہ مختلف وجوہ سے اسلام کے ساتھ کچھ ہمدردی نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے یہاں سب سے پہلے اُس طبقے کا ذکر کرنا چاہیئے جو جدید مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے زیرِ اثر اسلام سے دور ہوا ہے۔

ہمارے کچھ نہایت سینیئر حکام جنہوں نے پاکستان بننے سے پہلے جدید تعلیم کے ساتھ جدید ذوق نظر اور مغربی مذاق زندگی کو بھی اختیار کر لیا تھا۔ اور اپنی محنت اور قابلیت کے باعث آزادی سے پہلے مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہو کر ایک خاص ذہنی افتاد کے مالک بن چکے تھے، اپنی پُر وقار اور اسلام بیزار ذہنیت کے ساتھ ہمارے حصے میں آئے۔ اس طبقے کے زیرِ اثر یا اس کے حلقۂ اثر سے باہر کچھ نوجوان افسر جن میں بعض سنجیدہ علمی مذاق بھی رکھتے ہیں، ایک خاص طرزِ زندگی کے دلدادہ ہونے کے باعث اور کچھ اُن مواقع کی بدولت جو انہیں امریکہ یا انگلستان میں اعلےٰ تربیت پانے کی غرض سے میسر آئے، وہ مذہب لہٰذا اسلام سے دور ہو گئے۔ اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس طبقے کو نہ صرف اسلام سے بلکہ ہمارے ماضیٔ قریب کی تاریخ، تحریکِ پاکستان اور اقبالؔ اور قائد اعظم جیسی رہنما شخصیتوں سے بھی کچھ تعلقِ خاطر نہیں ہے۔ اقتدار کی آسائش اور معاشی بے فکری اور خوشحالی نے ان کو (بقول ان کے) عملی اور واقع پسند (MATTER OF FACT) بنا دیا ہے!!

ہمارے ادیبوں اور شاعروں اور فن کاروں کا ایک حصہ بھی اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کی تحریک عوام میں اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود آزادی کے ذرا پہلے کے دور کے ترقی پسند ادیبوں اور اس قبیل کے دوسرے دانش وروں تک براہِ راست نہ پہنچ سکی تھی۔ بعض نیشلسٹ علماء کی طرح ہمارے یہ ادیب اور فن کار بھی قائد اعظم کی زیرِ قیادت مسلمانانِ برصغیر کی سیاسی اور ثقافتی جدوجہد کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے سے قاصر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے ساتھ پاکستان اور بھارت میں آبادیوں کے انتقال کے لئے جو فضا پیدا ہوئی، اُس کے بہاؤ اور دباؤ میں بے شمار دانش ور ذاتی تحفظ کی غرض سے پاکستان تو چلے آئے تھے، لیکن ان کے ذہنوں کا انتشار دور نہ ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان کے جسموں نے تو ضرورتاً 'مسلمانی' کا لبادہ اُوڑھ لیا لیکن ان کے دل و دماغ کی "نامسلمانی" جوں کی توں رہی۔ برسوں بعد گزشتہ ستمبر کی جنگ نے البتہ ان میں سے اکثر کو ایک نئے جذباتی کرائسس (CRISIS) سے دوچار کر دیا۔ اور پہلی بار انہ

"دانشور ورون" کے افقِ نظر پر "حقیقت" کو جھٹلانے کی اجازت ملی۔ میرا خیال ہے جنگ کے واقعات نے ان میں سے اکثر کو اسلام کے لئے جیت لیا ہے!!

پھر خاصے دولت مندوں کا وہ طبقہ ہے جو دولت کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے بھی بہرہ مند ہے، ان کا ذوقِ جمال، ان کی آزادہ روی اور ان کا مذاقِ تعیش قدم قدم پر اسلام سے ٹکراتا ہے۔ اور اگر شعوری طور پر نہیں تو لاشعوری طور پر اسلام کے نام پر بلند ہونے والا ہر نعرہ ان کے جسم و روح پر خوف کی ایک خفیف سی لہر طاری کر دیتا ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں آزادہ روی کے علاوہ ان کی مفاد پرستی کو بھی برابر کا دخل ہے۔

بے تعلق گروہ کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ کچھ لوگ "باوقار" زندگی بسر کرنے کی دوڑ میں اپنے انہماک کے باعث مذہبی مسائل میں پڑنے کو بے ضرورت اور تضیعِ اوقات خیال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ سائنس، فلسفہ، یا خود مذہب کے مطالعہ میں سنجیدگی اور سوچ کے اُس مقام پر جا پہنچے ہیں جہاں مذہب میں دلچسپی قدرتاً بہت کم یا بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ بے حد محدود سا طبقہ اسلام سے اپنی بے تعلقی کے باوجود بالعموم ایسی اخلاقی اور انسانی قدروں کا حامل ہے کہ معاشرے کے بے شمار دوسرے گروہوں سے بہتر قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی "بے تعلقی" سطحی مطالعہ اور سرسری علم کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ اور ان کی یہ روش ہمارے معاشرے بالخصوص نئی نسل کے لئے ایک منفی اثر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں انگریزی، سائنس، فلسفہ اور نفسیات کے چند اساتذہ یہ ناقابلِ رشک کردار ادا کر رہے ہیں۔

ذی اثر طبقے کا تیسرا گروہ بعض نہایت سینیئر سرکاری حکام، تجربہ کار سیاسی رہنماؤں اور ملک کے کچھ ممتاز دانش وروں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اپنی جگہ پر سچے مسلمان ہیں۔ اسلام کے اصولوں کو ذاتی زندگیوں میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ملازمت کی مجبوریوں، سیاسی زندگی کی مصلحتوں یا پھر اپنی طبعی کم ہمتی اور تن آسانی کے باعث ان کا "ایمان" دوسروں کے لئے مشعلِ راہ نہیں بن پاتا۔

چوتھے اور آخری حصے میں پھر کچھ اعلیٰ سرکاری حکام، کچھ سیاست سے تعلق رکھنے والے افراد، کچھ تعلیم کے پیشے سے وابستہ اُستاد اور کچھ ادب و صحافت کے شہرت نصیب حضرات شامل ہیں۔ ان لوگوں کی مختصراً ذہنی کیفیت یہ ہے کہ یہ اسلام کی سچائی اور حقانیت کے دل سے قائل ہیں اور اسلامی قدروں کی ترویج کے آرزومند۔ ان کی یہ آرزو اور ان کا جذبۂ ایمانی ان کے اندر عمل کی خواہش بھی پیدا کرتا ہے۔ لیکن جدید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی کی پُرپیچ راہوں میں کسی سچے اور قابلِ اعتماد رہنا کے بغیر ان کے قدم آگے نہیں بڑھتے، اور ان کی نگاہیں دُور تک دیکھنے سے قاصر ہیں!

مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلامی تعلیمات میں سچی اور ولولہ انگیز قیادت کا فقدان ملک کے سبھی طبقوں کی دقت (HADICAP) اور محرومی ہے۔

(۲)

اوپر کا تجزیہ ملک کی عام آبادی سے تعلق رکھتا تھا۔ اب میں اُن حضرات کے بارے میں کچھ عرض کروں گا جو آزادی کے بعد سے اس ملک میں خصوصیت سے اسلام کے داعی ہوئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اِس مطالعے میں میں اُن ہزاروں نیک نفوس کا ذکر نہیں کروں گا جو دینی مدرسوں میں درس دینے، ملک کی لاتعداد مساجد میں وعظ کرنے یا اُس انداز سے رُشد و تبلیغ کے فرائض انجام دینے میں مصروف ہیں جو آزادی سے پہلے بھی ملک میں رائج و عام تھے۔ میں یہاں صرف اُن اربابِ فکر و قلم کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہتا ہوں جنہوں نے پاکستان بننے کے بعد جدید مسائل کا سامنا کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کا کوئی خاص شعور ملک کی آبادی میں پیدا کرنے کی نمایاں کوشش اور تحریک کی ہے۔

کڑی نظر سے دیکھا جائے تو صرف تین حضرات یہاں زیرِ بحث آ سکتے ہیں:۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اور جناب غلام احمد پرویز۔

لیکن اِس بحث کو چھیڑنے سے پہلے میں تمہیداً ایک بات بیان کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، جب سے ہم جدید مسائل سے دوچار ہوئے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں جب سے برصغیر کے مسلمانوں کا جدید مغربی تہذیب اور یورپ کے سیاسی تفوّق سے تصادم ہوا ہے، اِس صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے تین بنیادی اندازہائے نظر پیدا کئے ہیں۔

پہلا اندازِ نظر یہ ہے کہ جدید کو سرے سے تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ زندگی کی اصل نہج آج بھی وہی ہے جو چودہ سو سال پہلے تھی۔ جس طرح ہمارے بزرگ صدیوں سے زندگی بسر کرتے آئے ہیں اور اسلام کے اصولوں پر سختی سے کاربند تھے اسی طرح ہم کو بھی قائم رہنا چاہیئے۔ جدید کو سمجھنے کی ہر کوشش مفاہمت کا پیش خیمہ ہے اور ہمارے موقف سے ہٹانے کا باعث ہوگی۔

دوسرا اندازِ نظر یہ ہے کہ قدیم کی کوئی اہمیت اب باقی نہیں رہی۔ زندگی دم بہ دم بدلنے والی اور

ہر لحظہ آگے بڑھنے والی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ جو سکّہ کل رائج تھا، آج نہیں ہے، اور جو آج رواں ہے، کل نہیں ہوگا۔ ماضی کی طرف دیکھنا زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا نام ہے! جو حاضر ہے قابلِ توجہ ہے۔ جو حاضر نہیں قابلِ التفات نہیں۔ اسلام کی تعلیمات اچھی سہی لیکن ان کا دور بیت چکا ہے۔ دوسری قومیں سائنس اور ٹیکنالوجی اور "ترکِ مذہب" کی بدولت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں۔ ہمیں بھی اُن سے سبق سیکھنا چاہیئے اور جدید طور طریقوں اور جدید آدابِ زندگی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ مذہب سے وابستگی زندگی کے ارتقاء میں حائل ہوتی ہے۔

تیسرا اندازِ نظر جو دین اور زماں دونوں کے فہم پر مبنی ہے یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اپنی جگہ پر اٹل حقائق ہیں اور وقت بھی ایک صداقت ہے اور ان میں باہم کوئی تضاد اور تخالف نہیں۔ تضاد اور تخالف اُس دم پیدا ہوتا ہے جب یا تو دین کی حقیقت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی جائے یا وقت کی واقعیت سے اغماض برتا جائے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اِس اندازِ نظر کی رو سے دین فقط خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب قرآنِ حکیم اور اُسوۂ رسول ﷺ پر مشتمل ہے۔ احادیث و روایات اور فقہ و کلام و تصوف جملہ مجموعے خواہ اِن کی اسنادیت اور فیض رسانی کا کچھ بھی درجہ ہو، دین میں شامل نہیں ہیں۔ ادھر وقت انسانی علم و شعور کی بتدریج بیداری کا سمبل (SYMBOL) ہے، لہٰذا دین اور مرورِ ایّام کے ساتھ منکشف ہونے والے حقائق میں تخالف غیر ممکن ہے۔ اس اندازِ نظر کے علم برداروں کے نزدیک دین کی ایک اہم خدمت یہ ہے کہ اُن علمی انکشافات اور معاشرتی صداقتوں کی طرف سے آنکھیں بند نہ کرلی جائیں جو وقت کے ساتھ ظہور پذیر اور مستحکم ہوتی ہیں بلکہ اُن کو اپنی معاشرت میں جذب و اخذ کرلیا جائے۔ کیوں کہ یہ طرزِ عمل دین و حکمت کے بہترین تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

اِس پسِ منظر میں دیکھا جائے تو سید ابوالاعلیٰ مودودی پہلے اندازِ نظر سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس طبقۂ خیال کے نہایت مخلص، نہایت قابل، بڑے پُرجوش اور کامیاب رہنما ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے علمی محاسن میں نمایاں ترین پہلو یہ ہیں کہ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں (اور وہ دین اور زندگی کے تقریباً ہر موضوع پر لکھ چکے ہیں یا لکھ رہے ہیں) اُس کے متعلقات کا مطالعہ محنت اور دقّتِ نظر سے کرتے ہیں، اپنے خیالات کو ایک خاص سلیقے اور ہنرمندی سے ترتیب دیتے ہیں اور اظہار و ابلاغ کے فن میں کامل دست گاہ کے باعث تحریر کو جاذب، پُرزور اور ابلاغ کو اثر انگیز بنا سکتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے شخصی محاسن میں ان کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، اَن تھک قوتِ کار، اپنی ذات، علمیت، اور اعتقادات پر نہایت پختہ یقین، مستقل مزاجی اور بے خوفی شامل ہیں۔

ان کی شخصی کمزوریوں میں غالباً سب سے نمایاں یہ ہے کہ گذشتہ بیس پچیس برس میں ان کے بیشمار معتمد اور مخلص ساتھی اُن کی رفاقت سے عاجز آکر اُن سے الگ ہو گئے! ہمارے سامنے کی بات ہے کہ سرسید اور قائداعظم کا جو شخص ایک دفعہ گرویدہ، معتقد، یا معتمد ہوا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ اُس گرویدگی، اعتقاد اور اعتماد بڑھتا ہی گیا اور وہ ان رہنماؤں کے جتنا قریب ہوا، اسی قدر اس کی وابستگی زیادہ ہوتی گئی۔ سرسید کے آخری سالوں میں نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک کو بعض امور میں سرسید سے اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا اور اس اختلاف کا اظہار بالخصوص نواب وقارالملک مرحوم نے برملا کیا لیکن سرسید کی شخصی عظمت اور خلوص کا جو نقش اوّل روز ان کے دلوں میں بیٹھا تھا وہ آخری دم تک قائم رہا اور اختلاف کے باوجود وہ سرسید کی ذات اور تحریک کے ساتھ تازلیست وابستہ رہے۔ نفسیاتی تجزیئے اور دیگر اسباب کی چھان بین کا یہ موقع نہیں، تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بیشتر ذی علم معتمدان سے بددل ہو کر الگ ہوئے ہیں اور بحیثیت مجموعی اِن کی تنظیم بسوں پہلے جہاں تھی، آج بھی وہیں ہے بلکہ اس تھوڑے سے عرصے میں وہ جتنے قدم آگے بڑھی ہے شاید اس سے زیادہ اُسے پیچھے کو ہٹنا پڑا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سے اب تک سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جس قدر رسالے، کتابیں اور مضامین لکھے ہیں ان کو سامنے رکھئے تو آپ اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جدید زندگی کے جس قدر اہم مسائل اِس وقت پاکستان کی مسلمان سوسائٹی کو درپیش ہیں، سید صاحب کی ایک ایک پر نظر ہے۔ لیکن جب آپ اِن مسائل کے بارے میں اِن کے نقطۂ نظر کا تجزیہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُن کی بیشتر قوّتِ استدلال اور قدرتِ بیان اس مقصد کے لئے صرف ہو رہی ہے کہ آج کے دَور کو اُسی فقہ اور فکر کا پابند بنایا جائے جو صدیوں پہلے کے معاشرتی احوال میں ہمارے بعض نیک دل دانش وروں کی بدولت پیدا ہوئی تھی۔

زمین کا مسئلہ ہو یا یتیم پوتے کی وراثت کا سوال، تعدّدِ ازدواج کی بحث ہو یا ضبطِ ولادت کا موضوع، اسلامی معاشرے میں عورت کی حیثیت زیرِ نظر ہو یا آئین سازی کے مسائل، سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پُر وقار و متین و مخلص آواز روحِ عصر اور روحِ اسلام کے خلاف صدیوں پُرانی فقہ و روایات کی صدائے

بازگشت کے سوا کچھ نہیں !!

دینی مسائل میں خلوص، محنت اور علمیت اور چیز ہے اور نظر و بصیرت اور چیز ـــــ دونوں قسم کے محاسن کا آپس میں کوئی بیر نہیں، یہ سب محاسن کسی ایک شخصیت میں بھی جمع ہو سکتے ہیں اور اسلامی فکر کی تاریخ میں بارہا یک جا ہوئے ہیں لیکن بارہا اُن کی یک جائی ممکن نہیں بھی ہوئی ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات میں بھی یہ یک جائی ممکن نہیں ہو سکی !

اپنے پُرزور قلم، اپنی پُرتاثیر زبان، اپنی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت اور اَن تھک قوتِ عمل کی بدولت سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان کی تاریخ کے پہلے دَور میں (جو ابھی جاری ہے) بلاشبہ ہمارے معاشرے کے تقریباً سبھی طبقوں کو متاثر یا متنبہ کیا ہے۔ لیکن یہ تاثر امدیہ اتنباہ کچھ زیادہ تعمیری اور مثبت ثابت نہیں ہوا ہے۔ (اور اس کے دیرپا ہونے کا شائد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔)

اگر سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے کاندھوں پر روایات کا بیشتر بوجھ اُٹھا کر آگے بڑھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں تو جناب غلام احمد پرویز روایت سے یکسر بے تعلق اور بے زار دکھائی دیتے ہیں۔ جناب پرویز کے ہاں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقابلے میں جدید مسائل کا بہتر فہم پایا جاتا ہے۔ اُنہوں نے آئین سازی سے لے کر معاشرے میں عورت کی حیثیت تک ہر مسئلے پر روایات سے ہٹ کر صرف قرآن حکیم کی روشنی میں غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بہت سے معاملات میں وہ روحِ قرآنی کو پانے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن ان کے مزاج اور طریقِ کار کے تشدد نے اُن کے اثر کو ایک بہت ہی محدود طبقے سے آگے نہیں بڑھنے دیا !

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقابلے میں کم سہی تاہم جناب غلام احمد پرویز میں بھی تنظیمی صلاحیت کی کمی نہیں، لیکن ساتھیوں کے دلوں سے اعتماد یا شوقِ رفاقت کے اُٹھ جانے کے جو سانحات سید ابوالاعلیٰ مودودی کو وقتاً فوقتاً پیش آئے ہیں جناب پرویز کی زندگی بھی اس سے محفوظ و مصئون نہیں ہے تاہم ان کی تحریک یا کام کے لئے یہ واقعات کچھ زیادہ فیصلہ کن اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے ضمن میں میرے نزدیک فیصلہ کن امور حسبِ ذیل ہیں :-

اوّل :- احادیث کے بارے میں ان کے رویّے کی حد سے زیادہ سختی۔

دوم :- صوفیانہ مشاغل سے ابتدا یا بیزاری کے باعث روحِ تصوف ہی کی مخالفت۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوم:۔ روایات سے انکار کے سبب ماضی کے تمام علمی و دینی سرمائے سے انکار۔

چہارم:۔ سلف کے کارناموں کے صحیح شعور سے محرومی کے باعث اپنے کام اور کارناموں کا مناسب حد سے بڑھا ہوا احساس۔

میرا خیال ہے اُوپر کے بیان کی تھوڑی سی وضاحت یہاں بے محل نہ ہوگی۔

(۱) احادیث کے سلسلے میں جناب پرویز کا زاویۂ نگاہ شاید غلط نہیں ہے لیکن افراط و تفریط نے معاملے کی صورت بگاڑ دی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کہنے کو پرویز صاحب کا علمی مُوقف بھی وہی ہے جو علامہ اقبالؔ یا سرسیّد احمد خان کا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عام مسلمانوں نے جس طرح کا ردِّ عمل جناب پرویز کے لئے ظاہر کیا ہے اس نوع کا ردِ عمل سرسید اور علامہ اقبالؔ کے لئے ہرگز رونما نہ ہوا تھا۔ میری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤخر الذکر دونوں بزرگوں کا اِس بے حد نازک معاملے میں طرزِ عمل زیادہ حکیمانہ اور مبنی بر ژرف نگاہی اور نفسیات بینی تھا۔ اُنہوں نے بھی اکثر و بیشتر قرآن ہی سے استدلال کیا، لیکن حدیث کے خلاف کسی مہم کا آغاز کرکے مسلمانوں کی حمیّت کو ایک نئے افتراق یا نزاع سے دوچار کرنے کا خیال بھی اِن کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔

(۲) عجمی اور غیر اسلامی صوفیانہ مشاغل کے خلاف سرسید اور حالیؔ نے بھی دبی زبان سے آواز اُٹھائی، لیکن اقبالؔ نے تو اِس سوال کو بڑی شدّ و مد کے ساتھ اُٹھایا اور اپنی نظم و نثر اور خطوط و خطبات، ہر ذریعہ اور ہر وسیلہ سے کام لے کر اُس رنگِ تصوف کو مٹانے کی کوشش کی جو اُن کے نزدیک غیر اسلامی اثرات سے مسلمانوں میں رواج پاگیا تھا۔ تاہم جو تصوف اسلام کے اندر پایا جاتا ہے اور اسلامی تعلیمات کا ایک بنیادی جزو ہے، اقبالؔ نے اُس کی کبھی مخالفت نہ کی۔ آپ اُن اشعار کو دیکھئے جو اقبالؔ نے ہمارے عظیم صوفیاء مثلاً مولانا رومی، حضرت علی ہجویری، حضرت میاں میر، حضرت مجدد الف ثانی اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے بارے میں لکھے ہیں۔ اُن کے اسلوب زندگی سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ انہیں "بزرگانِ دین" سے کتنی عقیدت اور محبت تھی اور صوفیاء سے ملنے کا کیسا اشتیاق ان کے دل میں پایا جاتا تھا [۱]۔ وہ بارہا حضرت مجدد الف ثانی، خواجہ نظام الدین اور حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش)

---

[۱] ذکرِ اقبال، میں مرحوم عبد المجید سالک نے میاں شیر محمدؒ (شرقپور) کی خدمت میں علامہ کی حاضری کا واقعہ اور متعدد دوسرے واقعات بیان کئے ہیں: ذکرِ اقبال، ۱۳۱-۱۳۰۔

کے مزارات پر فاتحہ خوانی اور دعا کے لئے اہتمام اور شوق سے گئے۔ مجدد الف ثانی کے مزار پر اُن کی واردات و کیفیات کا بیان اِن کے صاحب زادے ڈاکٹر جاوید اقبال کے اُس مضمون میں بھی موجود ہے جو انہوں نے اپنے عظیم باپ کے متعلق لکھا ہے، اور ملفوظاتِ اقبال مرتبہ محمود نظامی میں شامل ہے۔

مختصراً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال جہاں غیر اسلامی تصوف کے شدید مخالف تھے وہاں اپنے سوز و گداز اور قلبی کیفیات کے لحاظ سے خود ایک صوفی اور مسلمان صوفی تھے۔ جناب پرویز نے تصوف کے خلاف اقبال کی لے کو تیز تر اور تلخ تر تو کر دیا لیکن اسلامی تصوّف کی جو روح اقبال کے ریشے ریشے میں سمائی ہوئی تھی، اُس کو نہ دیکھ سکے! نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کا وہ حصہ جو خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق پر زور دیتا، اور روحانی واردات کا سرچشمہ ہے، جناب پرویز کے ہاں مادی اور معاشرتی تعبیرات کا ایک دل خراش مرقع بن گیا ہے!

(۳) انسانی زندگی کا ایک المیہ یہ ہے کہ مصیبت کی طرح لغزشِ فکر بھی تنہا نہیں آتی۔ جناب پرویز نے حدیث کے متعلق جب اعتدال کی راہ چھوڑی تو کئی اور راہیں حق و بصیرت کی خود بخود اُن پر گم ہو گئیں۔ محدثین سے بدظنی ان کو شدہ شدہ سلف کے تمام مفسرین اور علمائے کرام سے بدظن کر گئی!۔ ان کے مضامین و رسائل دیکھئے یا ان کے درس کی تقاریر سنیئے آپ کو ان کے لہجے اور انداز میں جابجا سلف کے قریب قریب تمام کارنامے کی تضحیک کا احساس ہو گا۔

(۴) جب کوئی عالم کسی قوم کی لمبی تاریخ میں خود کو تنہا پائے اور اپنا آپ ہی اُس کو دکھائی دے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کیا اور کیسی رائے قائم کرے گا۔ جناب پرویز کی اکثر تحریریں اور "طلوعِ اسلام" میں شائع ہونے والے بیشتر مضمونوں سے پڑھنے والا اِس تکلیف دہ احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ جناب پرویز کے نزدیک یا تو قرآن حکیم کو خود رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی نے اور وہ بھی اپنے دَور کی ضروریات کی حد تک، سمجھا تھا اور خلفائے راشدین نے یا پھر صدیوں کے بعد طلوعِ اسلام کی تحریک نے قرآن کے مطالب کو دنیا پر روشن کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ درمیان میں قرآن فہمی کی کوئی استثنائی صورت ظہور میں آگئی ہو تو اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا! (واللہ اعلم بالصواب!)

شعر میں تعلّی ہمارے ہاں صدیوں سے روا ہے غالباً اس لئے کہ شعر کے پیرائے میں اپنے منہ سے اپنی تعریف پڑھنے والے کو کھٹکتی کم ہے۔ شاعر اگر خود [illegible] بیان مضمون کے عیب کو چھپا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتا ہے لیکن ہماری یہ بھی روایت ہے کہ شاعر جب نثر کا پیرایہ اختیار کرتا ہے تو اس شاعرانہ رعایت سے دست کش ہو جاتا ہے۔ حالی اور اقبال دونوں نے شعر کی دنیا میں اپنے کمالِ فن، اپنے ذاتی جوہر اور اپنے کام کی تعریف میں مضائقہ نہیں سمجھا لیکن ان دونوں بزرگوں کی نثر اٹھا کر دیکھئے کیا مجال جو 'تعلی' کا شائبہ تک پایا جائے۔ یہاں ان کے انکسار کا عالم دیدنی ہے۔ نثر میں ہمارے ہاں صرف (یہاں صوفیانہ نثر سے بحث نہیں) ابوالکلام آزاد نے کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی کھلے بندوں اپنی عظمت اور علم و بصیرت کا راگ چھیڑا ہے لیکن وہاں بھی ان کے مزاج کی شوریدگی، ان کی نثر کے شاعرانہ پن اور ان کی زندگی کے المیئے کو دیکھ کر قاری کو ان کی یہ ادا اکثر ناگوار نہیں گزرتی۔ جناب پرویز ٹھنڈے سبھاؤ اپنی عظمت بیان کرتے ہیں اور اس کا تاثر ناخوش گوار ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ انتہائی خلوص، سخت جانفشانی اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جناب غلام احمد پرویز اپنے اندازِ فکر اور طریقِ کار کی بعض معذوریوں (LIMITATIONS) کے باعث کوئی گہرا، دیرپا یا ملک گیر تاثر پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابیں، رسالے اور مضامین ملک کے طول و عرض میں پڑھے اور پڑھائے گئے ہیں اور پاکستان میں شائد ہی کوئی اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اشاعت اور فروخت (PUBLICATION & SALE) میں ان کا مقابلہ کر سکے۔ تاہم ملک کا ذہین اور دانش ور طبقہ ان کے حلقۂ اثر سے باہر رہا ہے۔[۱]

خلیفہ عبدالحکیم اپنی نظر و بصیرت کے اعتبار سے شاید آزادی کے بعد ملک میں واحد شخص تھے جو اسلامی فکر کی اس روائت کو تازہ کر سکتے تھے جو سرسید اور اقبال کے بعد کسی محرم اسلام کے انتظار میں چشم براہ اور جاں بہ لب ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم جس طرح جدید سے آشنا تھے، اسی طرح قدیم سے بھی واقف تھے۔ وہ ایک طرف جدید زندگی اور اس کے مسائل کو خوب سمجھتے تھے، اس کے مزاج شناس اور ہمدرد تھے اور دوسری طرف قدیم کے رمز شناس اور اسلامی تعلیمات اور اس کی روح و غائت کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ ان کے مزاج میں اعتدال، ان کی نظر میں وسعت اور ان کے فکر میں گہرائی تھی۔ غرض جدید زمانے میں اسلامی فکر کی صحت مند اور حیات بخش روائت کو آگے بڑھانے کے منصب کی جس قدر ذہنی، روحانی اور اخلاقی مقتضیات ہیں، خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ان میں سے بیشتر کو بہ طریقِ احسن پورا کرتے تھے لیکن بڑی حد تک ان کے مذاقِ علمی کے تنوع اور ذوقِ خوش وقتی نے اور ایک حد تک ان کی کم آرزومندی نے

---

[۱] سید سلیمان ندوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو اگر مہلت ملتی تو ان سے بھی عظیم توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں۔

انہیں اِس امر کی اجازت نہ دی کر وہ اُس کارنامے کو سرانجام دے سکتے جو اپنی ذہنی استعدادوں کی بنا پر اِن کے بس میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر خلیفہ عبدالحکیم کو سید ابوالاعلیٰ مودودی اور غلام احمد پرویز کا آدھا ذوقِ تنظیم، انہماک اور آرزومندی نصیب ہوتی تو اسلامی فکر کے میدان میں ہماری پس ماندگی اور افلاس کا وہ عالم نہ ہوتا جو آج ہے!۔

تاہم خلیفہ مرحوم نے 'اسلام کا نظریۂ حیات' لکھ کر اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھ کر ایک ایسا قدم اُٹھایا جو گذشتہ اٹھارہ برس کے دَوران اِس ملک میں اسلامی فکر و ثقافت کے نام پر اُٹھنے والے ہر قدم سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر ہے اور شاید سیدھی سمت میں تنہا قدم ہے!۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی، جناب، غلام احمد پرویز اور خلیفہ عبدالحکیم کے بعد مغربی پاکستان کی حد تک چند سوچنے اور لکھنے والے اور ہیں، جو یہاں قابلِ ذکر ہیں۔ کڑی نظر سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر ایس ایم اکرام نے اسلامی مسائل پر نہیں لکھا، تاہم سلسلۂ "کوثر" کی کتابیں اور اسلامی ثقافت پر اِن کے مضامین اور ان کی تالیف 'پاکستان کے بنانے والے' (MAKERS OF PAKISTAN) اِس امر کا ثبوت ہیں کہ وہ جدید اسلام کے مسائل کو بے شمار دوسرے 'مفکرینِ اسلام' سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پرانے لکھنے والوں میں پروفیسر محمد سرور، مولانا محمد جعفر ندوی اور مظہر الدین صدیقی کی اکثر تحریریں صحیح شعور اور راست غور و فکر کا پتہ دیتی ہیں۔ قدیم علمی سرمائے کا جدید ذوق و ضرورت کے مطابق جائزہ لینے کا کام اگر کوئی شخص ہمارے درمیان قابلیت اور ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دے رہا ہے تو وہ مولانا محمد حنیف ندوی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم کے بہت سے علمی اوصاف ڈاکٹر فضل الرحمان میں موجود ہیں لیکن یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ جو مسند مرحوم نے خالی کی ہے ڈاکٹر فضل الرحمان اپنے آپ کو اِس کا اہل بناتے ہیں یا نہیں۔

اِس حصۂ مضمون کے خاتمہ پر مجھے ایک ضروری بات اور کہنی ہے، اور وہ یہ کہ اگرچہ حکومت نے کئی ایک ادارے تحقیقاتِ اسلامی کے قائم کر دیئے ہیں اور ان میں خاصا کام بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اسلامی فکر کے میدان میں اس وقت جو خلا پایا جاتا ہے' مجھے شک ہے کہ وہ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے پُر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ایک زبردست عوامی تحریک اور عوامی رہنما یا رہنماؤں کی ضرورت ہے جو نہ صرف تعلیماتِ اسلامی کا سچا فہم رکھتے ہوں اور جدید زمانے کی ضروریات سے پوری طرح باخبر ہوں بلکہ تحریک کو منظم کرنے اور قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ اپنے فکر کو مقبول بنانے کا دم خم بھی رکھتے ہوں۔

© rasailojaraid.com